۲

مکان سہ منزلہ۔ اُوپر سے نیچے تک کمرے ہی کمرے مگر ایسے کہ بائسکل سے ناپ لو۔ صحن برائے نام کہ اُوپر سے دیکھو تو لگے کہ اندھیرے کنوئیں میں جھانک رہے ہیں۔ بوجان نے فوراً بوجھ لیا کہ متروکہ مکان ہے۔

"ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے گھروں کی لوگوں نے الاٹمنٹیں کرائیں اور کتنے تھے کہ تمہارے الاٹمنٹوں والاٹمنٹوں کے الجھیڑے ہی میں نہیں پڑے۔ قبضے کر کر کے بیٹھ گئے مگر ہمارے بیٹے کے دماغ میں تو ایسی رتیسی گھسی ہوئی تھی کہ اس نے پروا ہی نہیں کی۔ متروکہ مکان میں رہنے والا ایسا کونسا ہے جو کرایہ ادا کرتا ہے۔ بس ایک ہم ہی دنیا سے نرالے ہیں۔"

مگر جب بوجان نے اڑوس پڑوس میں یہ نقشہ دیکھا کہ ایک ایک متروکہ گھر میں تین تین چار چار مہاجر خاندان ٹھنسے ہوئے ہیں تو انہیں اس کے مقابلہ میں کرایہ دار بن کر رہنے ہی میں عافیت نظر آنے لگی۔ بس پھر انہیں اس مکان سے ایک ہی شکایت باقی رہ گئی کہ فارغ ہونے کے لئے انہیں اُوپر تیسری منزل پر جانا پڑتا تھا روز صبح کو جب وہ خالی لوٹے کے ساتھ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آتیں تو بڑبڑاتیں "بخت ماروں پہ یہ کیا خدا کی سنوار تھی کہ کھڈیاں آسمان پہ جا کے بنائیں۔" مگر اس مکان میں اچھے پہلو انہوں نے اتنے دریافت کر لئے تھے کہ یہ شکایت ان کے نیچے دب کر رہ گئی۔ یہ کیا کم بڑا فائدہ تھا کہ

پانچوں وقت اذان کی آواز گھر بیٹھے سنائی دیتی اور یوں نماز کے وقت کا پتہ چل جاتا۔ پھر قصائی کی دکان کتنی قریب تھی اور قصائی بھی کتنا اچھا تھا کہ خود ہی اچھی بوٹی والا گوشت بنا کر گھر پہ دے جاتا۔

مگر ایک روز یوں ہوا کہ ایک ٹیکسی دروازے پر آ کر رکی اور ایک ادھیڑ عمر عورت بر میں ساڑھی ماتھے پہ بندی اس سے اُتر کر ایک بچی کو انگلی پکڑائے اندر آئی "میا ذرا گھر دیکھنا ہے"

بوجان نے ناخوشگواری سے جواب دیا کہ "بی بی تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔ ہم تو ابھی اس گھر کو نہیں چھوڑ رہے"

"نہیں میا، تم جگ جگ اس گھر میں رہو۔ ہمارا اب اس پہ کیا دھیکار ہے۔ میں تو اپنی لالی کو دکھانے لائی تھی۔ بورڈ کھلا تو میری موسیٰ کے پُتر نے آ کے کہا کہ دیدی میں میچ دیکھنے تیرے لہور جا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ لالہ مجھے بھی لے چل۔ میں بھی اپنا گھر دیکھ لوں گی۔ لالی کو بھی دکھا لاؤں گی۔ دیکھ تو لے کہ میں نے اُسے کہاں جنا تھا"

بوجان نے حیرت سے اُسے سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر گھر کا ایک ایک کونا اُسے دکھایا۔

"بی بی، اپنے سے پہلے کی تو میں بات کرتی نہیں۔ مگر جب سے میں آئی ہوں میں نے تمہارے گھر کو بہت سنبھال کے رکھا ہے۔ ہر برسات کے بعد سفیدی کراتی ہوں۔ ذرا کوئی کونہ جھڑ جائے فوراً راج مزدور کو بلا کے مرمت کراتی ہوں"

آنے والی بی بی نے گھر کا تفصیل سے جائزہ لیا اور گھر کی صفائی ستھرائی دیکھ کر تشکر آمیز نظروں سے بوجان کو دیکھا۔ پھر ایک کوٹھری جیسے کمرے میں لے جا کر بچی کو کھڑا کر دیا "لالی، یاں پہ تیری نال گڑی ہے" بس یہ کہتے کہتے اس کی آنکھ بھر آئی۔ بچی کی انگلی پکڑ پلو سے آنکھ پونچھتی فوراً ہی باہر نکل آئی۔

"بی بی بیٹھو۔ چائے پی کے جائیو"

"نامیا۔ اپنا ٹھیا دیکھنا تھا وہ دیکھ لیا۔ تم راضی خوشی رہو"

یہ جا وہ جا۔

بوجان کئی دن چپ چپ رہیں۔ پھر بولیں۔ "بیٹے، کوئی اور گھر تلاش کرو"

میں نے بوجان کو حیرت سے دیکھا "کیوں۔ اس گھر میں کیا خرابی پیدا ہو گئی"

"خرابی ہو یا نہ ہو۔ میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی"

"وجہ؟"

"مجھے شک آوے ہے ہا اور اب کے جو گھر کرائے پہ لو وہ متروکہ نہ ہو"

"وہ کیوں؟"

"میرے لال میں کچھ سوچ ہی کے کہہ رہی ہوں۔ کسی غریب کی آہ لینی اچھی بات تو نہیں ہے"

بوجان اکھڑیں سو اکھڑیں۔ مجھے اتنا تکتکایا کہ میں آخر کو زچ ہو گیا۔ بھاگ دوڑ کر کے ایک دوسرا مکان کرائے پہ لیا اور متروکہ مکان کو سلام کیا۔

"اس ڈوبے مولوی کو کیا ہو گیا ہے۔ نہ خود سوتا ہے نہ محلے والوں کو سونے دیتا ہے"

بوجان کو آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ مسجد کی ہمسائیگی جس کی وجہ سے انہیں یہ مکان اتنا پسند آیا تھا کیا معنی رکھتی ہے۔ مگر انہیں تعجب اس پر تھا کہ بیتے دنوں میں تو مسجد کی ہمسائیگی گھر کے لئے رحمت کا سایہ بن جاتی تھی اور اس ہمسائیگی سے ایک طمانیت قلب حاصل ہوتی تھی۔ اب ایسا کیوں نہیں تھا۔ میری سمجھ میں تو بات آتی تھی۔

اس زمانے میں مسجدوں میں وعظ کم اور عبادت زیادہ ہوتی تھی۔ پھر اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر کا بھی تو چلن نہیں تھا۔

"اللہ بخشے مولوی سبحانی ہماری مسجد میں اذان دیا کرتے تھے"۔ بوجان کو چراغ حویلی کی ہمسایہ مسجد یاد آگئی۔ کیسا لحن تھا ان کی آواز میں۔ جو نماز سے بدکا ہوتا وہ بھی ان کی اذان سُن لیتا تو مسجد کی طرف کھنچا چلا آیا اور کتنی اونچی آواز تھی ان کی۔ صبح کی اُن کی اذان تو آس پاس کے گاؤں تک پہنچتی تھی"۔

"بوجان، وہ تو پھر لاؤڈ سپیکر کا کمال ہوگا"۔

"اے خاک پڑے تمہارے لاؤڈ سپیکر پہ۔ ہماری مسجد میں یہ تمہارا نام جہام نہیں تھا۔ مولوی سبحانی تو اسے شیطانی آلہ کہتے تھے۔ کسی نے ایک دفعہ اس کا نام ان کے سامنے لے دیا تھا۔ غصے سے کانپنے لگے۔ بولے یہ شیطانی آلہ مسجد میں آیا تو میں اذان دینی بند کر دوں گا"۔

مگر اس محلہ میں تو اس شیطانی آلہ کو کچھ زیادہ ہی رسوخ حاصل تھا۔ آئے دن یہاں شامیانے تنتے رہتے۔ آج فلانے کی شادی ہے۔ کل ڈھماکے کے ختنے ہیں اور شامیانہ اس طرح تنتا کہ گلی بند ہو جاتی۔ شامیانے کے ساتھ لاؤڈ سپیکر کہ اس زور پر فلمی گانوں کے ریکارڈ اتنا شور کرتے کہ بوجان عشا کی نماز کی خاطر کمرے کے دروازے کھڑکیاں سب بند کر لیتیں۔ کس مشکل سے نماز ختم کرتیں۔ کتنی مرتبہ تسبیح پھیرتے پھیرتے گڑبڑا جاتیں۔ جانماز لپیٹتے ہوئے بڑبڑاتیں کہ کمبختوں نے نماز پڑھنی دوبھر کر دی۔

بوجان تو بیزار تھیں ہی، میں بھی جلدی اس محلہ سے بیزار ہو گیا۔ یہاں سے بھاگنے کے جتن کرنے لگا۔ اب مکانوں کے کرائے اچھے خاصے بڑھ گئے تھے مگر میں نے دل میں کہا کہ زیادہ کرایہ دینا منظور ہے۔ اس محلہ میں رہنا منظور نہیں۔

مگر جو مکان زیادہ کرائے پہ لیا وہ نُورٌ علیٰ نُور تھا۔ جس گلی میں یہ مکان تھا اس کا

نقشہ عجب تھا۔ گلی کا گٹر مستقل ابلتا رہتا۔ کتنی دفعہ اس کی صفائی کرائی۔ مگر ہر دفعہ یہی ہوا کہ چار چھ دن درست رہا۔ اس کے بعد پھر اُبلنے لگا۔ کبھی کبھی اتنا اُبلتا کہ گلی میں ایک اچھی خاصی تلیا بن جاتی۔ تعفن اس پر مستزاد۔ ایک تعفن گٹر سے اُبلتے پانی کا، ایک تعفن کوڑے کے اس انبار کا جو پھیلتا بھی جا رہا تھا۔ بلند بھی ہوتا جا رہا تھا۔ کارپوریشن کی کوڑا گاڑی ہمارے یہاں وارد ہونے سے پہلے کبھی آئی ہو تو آئی ہو، ہمارے آنے کے بعد تو وہ یہاں کبھی آتے دیکھی نہیں گئی۔

سونے پر سہاگہ پڑوسن کے بچے کہ سویرے سویرے اس حال میں کہ آگا بھی کھلا ہے پیچھا بھی کھلا ہے۔ گھر سے نکل کر نالی پر قطار بنا کر بیٹھ جاتے۔ پھر ایک بچہ اس یکسانیت سے شاید بور ہو گیا یا شاید انفرادی حیثیت حاصل کرنے کے شوق میں پلٹن سے ٹوٹ کر اس نے ہمارے دروازے کے عین سامنے نالی پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ بوجان نے ایک دن دیکھا ضبط کیا۔ دوسرے دن دیکھا ضبط کیا۔ جب دیکھا کہ یہ تو روز کا معمول بن گیا تو ضبط کا یارا نہ رہا۔ پڑوسن کو دروازے پر کھڑا دیکھا تو باتیں شروع کر دیں۔ کوئی یہاں کی بات کوئی وہاں کی بات۔ آخر کسی قدر تامل کے بعد حرفِ شکایت زبان پر لائیں مگر اس طرح کہ اچھی خاصی لیپا پوتی بھی کر دی۔ "اے کوئی جان کر تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ آخر بچے ہی تو ہیں۔ اس عمر میں آگے پیچھے کا ہوش نہیں ہوتا۔"

پڑوسن نے بھی اپنی طرف سے بہت ضبط سے کام لیا۔ لہجہ میں اک ذرا درد ہی پیدا ہوئی۔ بولی "اے میا میرے بچے ایسے نہیں ہیں کہ تیری میری نالی میں بگتے موتتے پھریں۔ کوئی اور ہو گا۔ محلہ میں آخر اور بچے بھی تو ہیں۔"

پڑوسن نے اس وقت تو اتنا ہی جواب دیا۔ مگر اسی دن دوپہر کو وہ سامنے کے گھر کی کھڑکی سے جھانکتی بی بی سے مخاطب تھی اور غصے میں بھری بلند آواز میں

کہہ رہی تھی "بھلا میرے بچوں نے محلہ والوں کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ ہاتھ دھو کے ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں غریب ہوں تو کسی سے دب جاؤں گی۔ کسی نے میرے بچوں کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا تو اس آنکھ میں تنکے بھونک دوں گی۔"

ان حالات میں ہمارا اس کوچے میں بسیرا کتنے دن رہ سکتا تھا۔

"اِن کمبخت گلیوں سے تو چھٹکارا ملا۔" بوجان نے نئے گھر کے گرد و پیش کو دیکھ کر اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

یہ مکان لب سڑک تھا۔ سو گلیوں والی مصیبتیں یہاں نہیں تھیں۔ پڑوس بچوں کچوں والا نہیں تھا۔ دائیں تو ایک چھوٹی موٹی کوٹھی تھی۔ کم از کم فاصلہ سے تو کوٹھی ہی کا تاثر دیتی تھی۔ بائیں ایک ورکشاپ تھی۔ جس میں چند رکشائیں چند سکوٹر مرمت کے لئے کھڑے رہتے تھے۔ اسی مرمت میں ایسا مرحلہ بھی آجاتا کہ مستری رکشا کو آن کر کے چھوڑ دیتا۔ اس وقت کتنا شور ہوتا اور بیچ بیچ میں پٹاخے سے چھوٹتے کبھی کبھی یہ عمل لمبا ہو جاتا۔ لگتا کہ مستری رکشا کو آن کر کے بھول گیا ہے۔ بس اس وقت بوجان تھوڑی پریشان ہوتیں۔ جب رکشا رکنے میں نہ آتی تو بالآخر تڑپ اُٹھتیں۔

"ارے اس نحوست مارے مستری سے کہو کہ کیوں تو ہمارے کانوں کا دشمن ہو گیا ہے۔ تیرے کان کے پردے تو پھٹ گئے۔ مگر ہمارے تو ابھی سلامت ہیں۔"

شروع میں یہاں ایک ورکشاپ تھی۔ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اسی کے بغل میں ایک اور ورکشاپ کھل گئی۔ پھر یوں نظر آنے لگا کہ شہر کی ساری کھٹ بگڑی رکشاؤں کا آخری ٹھکانا یہی ورک شاپس ہیں جو چھت کے نیچے کم اور کھلی سڑک

پر زیادہ پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کھڑاک کو یہاں پھیلتے دیکھ کر کسی نے کل پرزوں کی ایک دکان کھول لی۔ پھر ایک ٹوٹا پھوٹا چائے خانہ کھل گیا جو رکشا ڈرائیوروں کا مستریوں کا، آس پاس گھومتے پھرتے نکھٹوؤں کا مرجع بن گیا۔

دھواں، ڈیزل کی بو، پٹے ہوئے سائلنسروں کا شور، چائے خانے میں بجتے ہوئے فلمی ریکارڈوں کا ہنگامہ، کھٹ بگڑی رکشاؤں کی قطاریں۔ دیکھتے دیکھتے اس علاقہ کی کیسی کایا کلپ ہوئی اور سڑک جو شروع میں مجھے کشادہ نظر آتی تھی، اب کتنی تنگ دکھائی پڑتی تھی۔

"بیٹے میں تو جانوں کہ لال کوٹھی والی جگہ ہی اچھی تھی۔ خواہ مخواہ وہ جگہ چھوڑی تم نے خود ہی چھوڑی۔ اس بچارے نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ ارے درخت وہ کاٹ رہا تھا تو کانٹے دیتے۔ آخر وہ اسی کی جگہ تو تھی اور وہ درخت ہمیں ایسے کونسے پھل دے رہے تھے۔"

بوجان بولتی رہیں۔ میں سنتا رہا۔ ویسے مجھے بھی اب محسوس ہونے لگا تھا کہ اس جگہ کو چھوڑ کر غلطی کی۔ وہاں سے نکل کر کتنے مکان بدلے، کس کس گلی میں جا کر رہا۔ شہر بیشک نہیں چھوڑا۔ مگر مکان تو بہت بدلنے پڑے۔ جب ایک مکان میں رہتے کچھ برس گذر جاتے اور اس کے در و دیوار سے تھوڑی جان پہچان ہو جاتی تو مالک مکان زیادہ کرائے پر اٹھانے کا خیال دل میں باندھ کر سر پہ آن کھڑا ہوتا کہ کرو مکان خالی۔ مالک مکان تقاضا نہ کرتا تو مکان کی حالت زار ستانا شروع کر دیتی۔ تب خود ہی خیال آتا کہ یہاں سے اٹھ ہی جائیں تو اچھا کریں۔ مکان خستہ نہ ہوتا تو محلہ کی حالت خستہ ہوتی چلی جاتی اور پھر نئے ٹھکانے کی تلاش۔ جو گھر ملا پہلے سے خستہ ملا۔ جس محلہ میں جا کر رہا وہ پچھلے محلہ سے بدتر ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ میرا حال بھی بد سے بدتر ہوتا چلا گیا یا شاید اس شہر کا نقشہ ہی میری دربدری کے ساتھ ابتر ہوتا چلا گیا۔

"بیٹے میری رائے تو یہی ہے کہ لال کوٹھی والی جگہ ہی کو جا کے دیکھو۔ وہیں کہیں گھر مل جائے تو اچھا ہے۔"

میں نے بھی سوچا کہ واقعی رہنے کے لئے وہی جگہ مناسب تھی۔ میں خواہ مخواہ جذباتی ہو گیا۔ درخت کٹ رہے تھے تو کٹنے دیتا۔ آخر آدم بھی تو اتنا کٹ گیا اور کٹتا ہی چلا جا رہا ہے۔ میں نے اس پر کب احتجاج کیا۔

تو میں مکان کی تلاش میں ایک مرتبہ پھر اس نواح میں گیا۔ مگر میں تو وہاں جا کر گڑبڑا گیا۔ در و دیوار ہی بدلے ہوئے تھے۔ یہاں سے وہاں تک دکانیں ہی دکانیں مال و اسباب دکانوں کے اندر بھرا ہوا۔ اندر سے زیادہ باہر پھیلا ہوا۔ سواریوں کی ریل پیل۔ ریڑھے، رکشائیں تانگے، موٹریں۔ یہاں دکانیں زیادہ تر تعمیری سامان کی نظر آ رہی تھیں۔ اسی وجہ سے یہاں ریڑھوں کی بہتات تھی اور ان کی وجہ سے سڑک اتنی تنگ ہو گئی تھی کہ سواری میں سواری بھڑی نظر آتی تھی۔

تھوڑا آگے بڑھا تو اور ہی بھیڑ بھڑکا دکھائی پڑا۔ گوروں کے رد کئے ہوئے کوٹ پتلون، سوئیٹر، مفلر، اوور کوٹ، غرض ہر رنگ ہر طرز کی اُترن ریڑھیوں پر لدی ہوئی لوگ اس اُترن پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ خریداروں کی بھیڑ اتنی تھی کہ سچ مچ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ کس مشکل سے میں اس بھیڑ کے بیچ سے گذرا۔

میں نے بہت اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ لال کوٹھی یہاں کہاں تھی۔ کہیں اس کے اثر آثار نظر نہ آئے۔ جیسے یہاں نہ کوئی لال کوٹھی تھی نہ کوئی درخت نام کی چیز تھی۔ میں لال کوٹھی کے سامنے والی اس خاموش سڑک کو دھیان میں لایا جس پر درخت دو رویہ دور تک قطار باندھے دکھائی دیتے تھے۔ وہ سڑک تو معدوم نہیں ہو سکتی اسے تو یہیں ہونا چاہیے۔ ضرور ہو گی۔ مگر میں اسے کسی صورت شناخت نہ کر سکا۔

میں حیران، میں کہاں آگیا ہوں، وہ شجر حجر کہاں کھو گئے، وہ شجر حجر، وہ کشادہ رستے وہ پُروقار در و دیوار۔

"بوجان، وہ جگہ تو اب بہت بدل گئی ہے۔"

"اے بیٹے، کتنی بدل گئی ہوگی۔ جگہیں ایسے تو نہیں بدلا کرتیں کہ بالکل ہی بدل جائیں۔"

"مگر بوجان، وہ جگہ بالکل بدل گئی ہے۔"

"اچھا تم کہتے ہو تو مانے لیتی ہوں۔ ویسے آخر تم اتنے دن وہاں رہے۔ کسی جاننے والے کو پکڑا ہوتا۔ کوئی مکان اس کے واسطے سے مل ہی جاتا۔"

بوجان، میں آپ کو کیا بتاؤں۔ نہ وہ لوگ، نہ وہ در و دیوار، نہ وہ درخت، نہ وہ رستے وہاں تو دنیا ہی بدلی ہوئی ہے وہ جگہ اب رہنے کے لائق نہیں رہی۔"

"اچھا" بوجان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ انہیں میری بات کا اعتبار نہیں آیا ہے۔ بس جیسے یہ سوچ کر کہ اڑیل لڑکے سے کون بحث کرے چپ ہو گئی تھیں۔

میں نے آنکھوں سے دیکھا نہ ہوتا تو مجھے بھی کہاں اعتبار آتا۔ یہاں سے مجھے احساس ہوا کہ دنیا تب سے اب تک کتنی بدل گئی ہے اور شہر کیا سے کیا ہو گیا ہے شہر کا وہ پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ پت جھڑ کی دوپہریں۔ سڑک پر پیلے پتوں کا بستر بچھا ہوا۔ ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو ایک دم سے پیلی ٹہنیوں میں کھلبلی مچتی سوکھے پتے کھڑکھڑاتے، ٹہنیوں سے باجماعت جھڑتے اور پکی سڑک پر فٹ پاتھ پر گر کر پہلے سے گرے ہوئے پتوں کے ساتھ رَل مِل جاتے۔ ہوا کا جھونکا گذر جاتا اور پھر

خاموشی چھا جاتی۔ پھر یہ خاموشی اس وقت ٹوٹتی جب پھر کوئی تیز جھونکا آتا یا جب کوئی کار فراٹے سے اس سنسان راہ سے گذرتی اور سوکھے زرد پتے اس طرح کلبلاتے جیسے بچوں کی بھیڑ تالیاں بجاتی کار کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ کار تیزی سے گذر جاتی، بچے تھک کر پیچھے رہ جاتے، لال حویلی کی سڑک سے لے کر مال روڈ تک اس شہر کی کتنی سڑکیں پت جھڑ کے اس منظر کے ساتھ تصور میں گھوم گئیں۔ موسموں کا اپنا جادو ہوتا ہے۔ موسموں میں سب سے بڑھ کر پت جھڑ کا کہ ایک تو اس کا اپنا جادو، ایک زرد پتوں سے پھیلتی ویرانی کا جادو، خاص کر دوپہر میں کہ پت جھڑ کی دوپہریں جیٹھ کی ٹیکا ٹیک دوپہریوں سے بڑھ کر جادو بھری ہوتی ہیں۔ زمانہ، میں نے سوچا، کتنا بدل گیا ہے اب اس شہر میں ٹریفک کے شور اور فلک بوس عمارتوں کے ہجوم میں پہروں اور موسموں کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ نہ جاتی رُت کی اُداسی کا احساس ہوتا ہے نہ آتی رُت کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ نہ دیواروں چھتوں پر اُترتی چڑھتی دھوپ اپنے اُترنے چڑھنے کا پتہ دیتی ہے نہ ڈھلتے دن کی دبے پاؤں پھیلتی چھاؤں اپنی خبر دیتی ہے اور کان نہ اس سے آشنا کہ درخت کیا کلام کرتے ہیں نہ یہ سننے پر آمادہ کہ پرندے کونسی بانی سناتے ہیں۔ شہر بدل گیا۔ شہر والوں کے حواس کند ہو گئے۔

تب رفتہ رفتہ بوجان کی بات نے دل میں گھر کرنا شروع کیا۔ خیر بوجان تو آہستہ سے اتنا کہہ کر چپ ہو جاتی تھیں کہ بیٹے اس طرح اُٹھاؤ چولہا کب تک بنے پھرو گے۔ قدم جمانے کے لئے اور سر چھپانے کے لئے اپنا کوئی جھونپڑا ہونا چاہیے مگر جب بیوی نے گھر میں قدم رکھا تو اس نیک قدم نے یہی بات زیادہ بلند آہنگی

سے اور تکرار کے ساتھ کہی۔ بیوی جب نئی نئی ہوتی ہے تو اس کی بات زیادہ اثر کرتی ہے۔

"دیکھتے نہیں ہو، مکانوں کے کرائے کتنے بڑھ گئے ہیں۔ آج مکان بدلیں تو آدھی تنخواہ تو کرائے ہی میں نکل جائے گی۔"

میں قائل ہو گیا۔ زبیدہ نے بات غلط تو نہیں کہی تھی۔ مکانوں کے کرائے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ شروع میں یہاں مکان کتنے تھوڑے کرائے پر مل جایا کرتے تھے اور کتنی آسانی سے مل جاتے تھے۔ ان شروع کے برسوں میں مجھے جو بھی مشکل پیش آئی مکان میں بسنے کے بعد پیش آئی۔ مکان بدلنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ مگر برس جتنے گذرتے گئے، مکان کی تلاش میں اتنی ہی مشکل پیش آئی گئی۔ شہر پھیل رہا تھا۔ نئی آبادیاں وجود میں آ رہی تھیں۔ نئی تعمیرات کا وہ زور تھا کہ کشادہ علاقے گنجان ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جو قطعات کب سے بے مصرف پڑے تھے وہاں عمارتیں قطار اندر قطار کھڑی ہو چکی تھیں۔ مگر مکان جتنی کثرت سے تعمیر ہوئے اتنی ہی ان کی قلت ہوتی چلی گئی۔ جتنی قلت ہوتی گئی اتنے کرائے بڑھتے گئے۔

تو ایک تو کرائے کے مکان کی دقتوں کا احساس۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید بوجان ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ قدم جمانے کے لئے زمین کا اپنا کوئی ٹکڑا ہونا چاہیے۔ شاید میں بکھرا ہوا آدمی اسی وجہ سے ہوں کہ نگھرا ہوں۔ قدم جمانے اور سر چھپانے کے لئے کوئی کونہ مل جائے تو شاید اپنی زندگی میں بھی کوئی جماؤ پیدا ہو جائے سو مکان بنانے کا خیال جس سے آگے وحشت ہوا کرتی تھی اب میرا مسئلہ بن گیا۔ اب یہ وقت آیا کہ میں نے دفتر میں ساتھ کام کرنے والوں کے غم روزگار میں حصہ بٹانا شروع کر دیا۔ یہ لوگ کب سے اپنی کالونی کی کچڑی پکا رہے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے یہی ایک ذکر کہ ایل ڈی اے سے کیا بات ہوئی۔ کس افسر نے کیا وعدہ کیا، کونسی

ہاؤسنگ سکیم کب بروئے کار آنے والی ہے۔ میں ان باتوں سے کتنا بور ہوتا تھا۔ دفتر میں چائے پیتے پیتے کوئی رفیق کار یہ ذکر چھیڑ دیتا تو میں بس بے مزہ ہو جاتا "یار اس وقت نہیں۔ تمہاری حساب کتاب کی باتوں سے چائے کا لطف غارت ہو جاتا ہے۔" مگر اب اس ذکر فکر میں میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ اور جب کالونی کا منصوبہ سالوں کی بھاگ دوڑ کے نتیجہ میں پروان چڑھا تو میں رفقائے کار کی خوشی میں برابر کا شریک تھا۔ قرعہ اندازی ہوئی۔ میرے نام بارہ مرلے کا پلاٹ نکلا۔ میں باغ باغ ہو گیا۔

"بیٹے دیکھ بھی لیا ہے کہ زمین کیسی ہے؟"

"بوجان اچھی زمین ہے۔"

"پہلے استخارہ کرا لیا ہوتا۔ زمین استخارے کے بغیر نہیں لینی چاہیے۔"

"استخارہ؟ ــــ اگر استخارہ منع آجاتا تو پھر میں تو پلاٹ سے گیا تھا۔"

"میرے لال"۔ بوجان نے سمجھاتے ہوئے کہا "زمین کا ساتھ عمر بھر کا ہوتا ہے۔ خریدنے سے پہلے بہت سوچنا سمجھنا پڑتا ہے۔"

میں دل میں ہنسا۔ بوجان اپنے زمانے کے حساب سے سوچ رہی تھیں۔ جو زمانہ انہوں نے دیکھا برتا تھا: اس میں بے شک یہی طور تھا۔ آدمی مکان زندگی میں ایک مرتبہ بناتا تھا۔ جہاں جس زمین پہ بنا لیا سو بنا لیا۔ پھر وہ پشتوں تک چلتا تھا۔ اپنی چراغ حویلی ہی تھی۔ کس زمانے کی بنی ہوئی تھی۔ کتنی نسلیں اس میں پروان چڑھیں۔ کتنے موسم اس پر آئے اور گذر گئے۔ ان موسموں کے ساتھ کتنی چڑیوں نے اس کے روشندانوں میں گھونسلے بنائے، انڈے دیئے، بچے نکالے، بچوں کے پر آنے کے ساتھ گھونسلے چھوڑ کر اڑ گئیں۔ کتنی انجنہاریوں نے اس کی اونچی دیواروں پر اپنے مٹیا محل تعمیر کئے۔ اپنے سندر سیاہ سنہری وجود کے ساتھ ان میں رچیں بسیں، بچے دیئے اور پھر ریزہ ریزہ جمع کر کے بنائے ہوئے محل کو چھوڑ کر کہیں آگے سدھار گئیں۔ ہماری بڑی بوا نے کبھی کسی بچے کو انجنہاری کا گھر توڑنے

چھوڑنے کی اجازت نہیں دی۔ کہا کرتی تھیں کہ جس گھر میں انجنہاری کے گھر بنانے کا مطلب تھا ایک نئی پیدائش کی خبر انجنہاری کے گھر میں بھی اور اس گھر میں بھی جہاں وہ اپنا گھر بناتی تھی۔ بڑی بوکے اس عقیدے کو بوجان نے بھی اپنایا۔ انہوں نے مجھے یا میرے ساتھ کے کسی بچے کو انجنہاری کا گھر اجاڑنے کی اجازت نہیں دی۔ مگر وہ زمانہ تو چراغ حویلی کے ساتھ گذر گیا۔ اب تو عقلمندوں نے یہ طور پکڑا تھا کہ ہر نئی ہاؤسنگ سکیم کے شروع ہونے پر پلاٹ کے لئے عرضی داغ دی۔ پلاٹ مل گیا تو اسے تھوڑے دنوں ڈالے رکھا۔ پھر منافع پر بیچ کر کسی اگلی سکیم میں پلاٹ کے لئے بھاگ دوڑ کی۔ پلاٹ ملنے پر مکان بنا بھی لیا تو بھی لازم نہیں کہ اس میں پوری عمر گذاریں۔ نئے زمانے کے تعمیر کرنے والے جس شوق سے مکان تعمیر کرتے ہیں۔ اسی شوق سے منافع ملنے کی صورت میں اسے فروخت کر ڈالتے ہیں۔

تو خیر میں نے بوجان کو سمجھایا کہ نئی ہاؤسنگ سکیموں میں زمین حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے یہ کہ ان سکیموں میں استخارے کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ ان کی بنیاد قرعہ اندازی پر ہے۔ پھر جو پلاٹ الاٹ ہو گیا سو ہو گیا۔ مگر بوجان کو اس وقت تک اطمینان نہیں ہوا۔

جب تک انہوں نے مولوی غلام رسول کو بلا کر پوچھ نہیں لیا۔ مولوی غلام رسول بھی پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اپنے علم سے زمینوں کا نیک و بد فوراً جان لیتے تھے۔ انہوں نے بوجان کو اطمینان دلایا کہ زمین کسی بد روح کے اثر میں نہیں ہے۔ مگر یہ کہ صدقہ تو ہر زمین مانگتی ہے۔ سو بنیاد رکھتے وقت اس کا اہتمام ہو جانا چاہیے۔ وہ ہوا۔ اس مبارک موقعہ پر بوجان نے انہیں ہی زحمت دی۔ انہوں نے جنتری دیکھ کر بنیاد رکھنے کے دن اور ساعت کا تعین کیا۔ نیو رکھے جانے سے پہلے پلاٹ کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر دیر تک کچھ پڑھا، چاروں سمتوں میں منہ کر کے پھونکا اور پھر کالے بکرے کے گلے پر چھری پھیری اس کے گلے سے ابلتا ہوا گرم گرم خون بنیاد میں ڈالا گیا۔

نیو تو دھری گئی اور جب نیو دھری جاتی ہے، یہی لگتا ہے کہ بس اب مکان بن کر کھڑا ہوا۔ مگر ایسا کہاں ہوتا ہے۔ میرے پاس الہ دین کا چراغ ہوتا تو راتوں رات مکان بنا کر کھڑا کر دیتا۔ مگر یہ تو تھکا دینے والا عمل نکلا۔ زمین کہے مجھے چھو کے دیکھو مکان کہے مجھے شروع کر کے دیکھو۔ جنگ اور عشق کے متعلق تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ ان کے آغاز کا تو پتہ ہوتا ہے، مگر انجام کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ مکان کی تعمیر بھی جنگ اور عشق کی ٹکر کا قصہ ہے۔ بوجان سچ ہی کہتی تھیں کہ جن اور راج مزدور ایک دفعہ گھر میں داخل ہو جائیں تو پھر انہیں خدا ہی نکالے تو نکلتے ہیں۔ تعمیر کا آغاز میں نے کس ولولہ سے کیا تھا۔ آخر میں کتنا تھک گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اسی طرح چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ پیسے کو جیسے پیسے لگ گئے ہوں۔ تعمیر ہوتے مکان کا منکھلا ہوتا ہے۔ رقم انڈیلے چلے جاؤ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس کنوئیں میں گئی۔ زبیدہ نے شادی کے دوسرے ہی دن سے گھر کی خستہ حالی اور گلی کی ابتری دیکھ کر دل پہ دھر لیا تھا کہ اپنا مکان بنانا ہے اور اسی وقت سے اس خاطر پیسہ جوڑنا شروع کر دیا تھا اور حق یہ ہے کہ چند ہی برسوں میں اچھی خاصی پونجی جوڑ لی تھی۔ مگر وہ جمع پونجی تو پہلے ہی ہلہ میں نکل گئی۔ پھر قرضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دفتر سے قرضہ، ہاؤسنگ فنانس کارپوریشن سے قرضہ، بنکوں سے قرضہ، ایک بنک سے، دوسرے بنک سے، پھر تگڑم لڑا کے کسی تیسرے بنک سے پھر دوستوں اور ملنے والوں کی باری آئی۔ پہلے لمبے قرضے پھر جتنا جس سے مل جائے۔ آخر آخر میں تو سو سو دو دو سو تک کے قرضے بھی لئے گئے۔ جس نے جتنا دے دیا، بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھ کر غنیمت جانا۔ یہ سوچ کر دل کو سمجھایا کہ بوند بوند کر کے ہی تالاب بھرتا ہے۔ مگر بھرتا دکھائی تو دے۔

میں نے جگری دوستوں سے پریشانی بیان کی۔ کامریڈ نے تو زہر خند سے میری بات کا جواب دیا "ہور چوپو گنے"۔ اصل میں کامریڈ تو سرے سے مکان بنانے ہی کے خلاف تھا۔ مکان بنانے پہ کیا موقوف تھا، میں نے جب ملازمت شروع کی تھی تب

بھی اس کا ردِ عمل خلاف ہی تھا۔ جب میں نے شادی کی اس پر بھی اس نے بیزاری ہی کا اظہار کیا۔ شادی، گھر بار، ملازمت، اس کے حساب سے یہ سب جھمیلے ہیں جو آدمی کو انقلاب سے دور لے جاتے ہیں اور سرمایہ داروں سے سمجھوتہ کرنے اور ضمیر کا سودا کرنے پہ مجبور کرتے ہیں۔

ممتاز نے البتہ دلجوئی کی مگر عجب انداز سے کہنے لگا "یار کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم نے کوئی نیا قرضہ لیا ہے۔ مکان تو ہمیشہ قرضے ہی سے بنتا ہے اور مکان کے لئے قرضے اسی طرح لئے جاتے ہیں۔"

"مگر یار قرض جہاں جہاں سے مل سکتا تھا وہاں سے لے چکا۔ مکان پھر بھی ادھر بنا ہے۔ آگے گاڑی کیسے چلے۔"

"یہی ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔ راج مزدوروں کو چھٹی دو۔ ٹھیکیدار سے معذرت کرو۔ مگر نہ راج مزدور ٹلتے ہیں نہ ٹھیکیدار پنڈ چھوڑتا ہے۔ بس پھر کسی نہ کسی طرح گاڑی چل پڑتی ہے اور لشٹم پشٹم چلتی رہتی ہے۔"

"کیسے چلتی رہتی ہے۔"

"ایسے کہ جب آدمی باہر سے قرضے لے چکتا ہے تو پھر گھر بار کا جائزہ لیتا ہے۔ پہلے بیوی کا زیور گروی رکھا جاتا ہے۔ پھر جہیز میں آئی ہوئی قیمتی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ سب سے آخر میں گھر کے برتن بکتے ہیں۔"

"یار یہ تو تم بہت بھیانک نقشہ پیش کر رہے ہو۔"

"کوئی بھیانک نقشہ نہیں ہے۔ جب مکان بن جاتا ہے تو مر پٹ کر قرضے ادا ہو ہی جاتے ہیں۔"

جو بات ممتاز نے کہی وہی زبیدہ نے بھی کہی۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ بولی "تم مکان بن جانے دو۔ قرضوں کا کیا ہے وہ تو ادا ہو ہی جائیں گے۔ بس

یہی ہوگا کہ گھر کے اخراجات کم کرنے پڑیں گے۔ نہیں کھائیں گے تر نوالہ۔ روکھی سوکھی کھا لیں گے۔ گھر تو اپنا ہوگا۔ اپنے گھر میں آدمی روکھی سوکھی کھا کے بھی خوش رہتا ہے۔"

اصل میں ایک چوک مجھ سے بھی ہوئی۔ وہ چوک ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہوئی۔ خرچ کا تخمینہ لگاتے وقت یہ بات تو ملحوظ ہی نہیں رکھی گئی کہ رقمیں نذر بھی کرنی ہوں گی۔ آخر نقشہ بھی منظور کرانا تھا اور سیمنٹ کا پرمٹ بھی لینا تھا اور ایسے ہی چھوٹے چھوٹے سو خرچے تھے۔ پھر یہ کہ تخمینہ لگاتے وقت تعمیری سامان کی قیمتیں کچھ تھیں، تعمیر ہوتے کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔

خیر جیسی پڑتی ہے سہارنی پڑتی ہے۔ اس صورتِ حال سے مفر تو نہیں تھا۔ تعمیر ہوتا مکان آدمی کو بھاگنے تو نہیں دیتا۔ تو مکان لشتم پشتم گذارے لائق بن ہی گیا۔ بیشک اس میں کھانچے رہ گئے تھے۔ مگر ممتاز نے اچھی بات کہی کہ نیا بنا ہوا مکان مکمل طور پر بنا ہوا کبھی نہیں ہوتا۔ کمیاں رہ ہی جاتی ہیں جو بعد میں پوری ہوتی رہتی ہیں تو میں نے بھی سوچا کہ جو حصے ادھ بنے ہیں انہیں فی الحال نظر انداز کرو اور مکان کو مکمل جانو۔ بس اس میں آباد ہو جاؤ۔ تب میں نے پہلی مرتبہ باہر کھڑے ہو کر مکان پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ ایک حیرت اور ہیبت نے مجھے آلیا ——— سنگ و خشت کا ایک پہاڑ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اچھا یہ تعمیر میں نے ایک عجب تجربہ ہے۔ نیا مکان آدمی کو رجھاتا بھی ہے، ڈراتا بھی ہے۔ زبیدہ خوش تھی۔ بوجان بھی خوش تھیں اور میں؟ میں خوش بھی تھا اور اداس بھی۔ تھوڑے رومانس کا احساس تھوڑا خوف۔ ایک اطمینان کہ آخر کار اپنا ایک گھر ہو گیا۔ ساتھ میں بے اطمینانی بھی اور تذبذب۔ بات یہ ہے کہ پتہ تو نہیں ہوتا کہ نئے در و دیوار سے ہمارا رشتہ کس رنگ سے قائم ہوگا، ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ کتنے معاملات کیا کیا قصے ہوتے ہیں۔ شادی غمی کے کتنے واقعات گذرتے ہیں۔ تب کہیں جا کر در و دیوار کے ساتھ

رشتہ قائم ہوتا ہے۔ پھر ہر شادی ہر غمی کے ساتھ جوان در و دیوار کے بیچ گذرتا ہے۔ رشتہ گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس آن مجھے چراغ حویلی کی یاد آئی۔ اس کے در و دیوار سے رشتے میرے پیدا ہونے سے پہلے قائم ہو چکے تھے۔ میری پیدائش سے پہلے کتنے جنازے اس ڈیوڑھی سے نکل چکے تھے اور کتنے ڈولے اس ڈیوڑھی میں داخل ہو چکے تھے۔ میری پیدائش کے بعد بھی

اس ڈیوڑھی سے کئی جنازے نکلے۔ کئی ڈولے اس ڈیوڑھی میں آئے، کئی ڈولے اس ڈیوڑھی سے رخصت ہوئے۔

آخری جنازہ کہ اس ڈیوڑھی سے نکلا، میاں جان کا تھا کہ اس کے بعد خاندان کا خاندان اس ڈیوڑھی سے نکل گیا۔ خیر میاں جان تو بعد میں گئے۔ بڑی بُوان سے پہلے ہی سدھار گئیں۔ کتنے دنوں پلنگ پہ پڑی رہیں۔

سانپ والی کوٹھری کے برابر والے کمرے میں ان کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ جانے کب سے بیمار چلی آ رہی تھیں۔ تندرست بھی ضرور رہی ہوں گی۔

مگر میں نے ان کی تندرستی کا زمانہ نہیں دیکھا۔ جب سے ہوش سنبھالا انہیں بستر بیماری پہ پایا۔ دن رات اسی کمرے میں بستر پہ دراز رہنا، تھوڑا تھوڑا کراہتے رہنا۔ کبھی تکلیف کم ہوتی اور چہرے پہ بحالی آجاتی تو اُٹھ کر بیٹھ جائیں۔ پھر دور دور کی سوجھتی۔

"اے بیٹے اخلاق، یہ کیا سنگھاڑے والا گلی میں بول رہا ہے؟"

"جی بڑی بوا"

"اے ہے پوری فصل گذر گئی میں نے تو سنگھاڑا چکھا ہی نہیں" گلے میں پڑے بٹوے سے اکنی نکالتے ہوئے "یہ لے ذری اکنی کے سنگھاڑے میرے لئے لادے۔ چکھ کے تو دیکھوں"

"ابھی لایا"

دم کے دم میں سنگھاڑے حاضر۔

بوجان کا آکر دیکھنا اور ٹوکنا "بڑی بو، یہ آپ کیا بدپرہیزی کر رہی ہیں۔ خدا خدا کرکے تو طبیعت ذرا سنبھلی ہے۔ سخت چیزیں کھائیں گی تو پھر طبیعت بگڑ جائے گی۔"

"نہیں بہو، سخت نہیں ہیں۔ کھا کے دیکھو۔ بالکل پھول ہیں۔

"پھر بھی۔ ہیں تو آخر سنگھاڑے ہی۔"

"بہو جاتی فصل کا میوہ ہے اور ہم بھی اب چلنے ہار ہیں۔ اگلی فصل کس نے دیکھی ہے۔ چلی گئی تو یہ تمہارے انگھاڑے سنگھاڑے کھانے کے لئے واپس تو نہیں آؤں گی۔"

"نہیں بڑی بو، شیطان کے کان بہرے۔ ایسی بدشگنی کا کلمہ کیوں منہ سے نکالتی ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ آپ کے چہرے پہ رونق ہے۔ آپ کے بیٹے تو واقعی ڈر گئے تھے۔ مگر اللہ نے بڑا کرم کیا۔"

اس دن بڑی بو کے چہرے پہ واقعی رونق تھی۔ مگر رات ہوتے ہوتے طبیعت بگڑی وہ چراغ کا آخری سنبھالا تھا۔ بس پھر ایک دم سے گل ہوگیا۔ چہرے پہ آئی ہوئی رونق اسی طرح رہ گئی۔

دوسرے دن جب بوجان کے دل کو تھوڑا قرار آیا تو انہوں نے پرسا دینے والیوں کے سامنے ذکر کرتے ہوئے بار بار یہی کہا "بی بی کیا بتاؤں، چہرے پہ کتنا سکون تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ مرگئی ہیں۔ بس ایسا لگتا تھا کہ سو رہی ہیں۔ جیسے باتیں کرتے کرتے آنکھ لگ گئی ہو۔" پھر جنازے پہ تبصرہ "کیا بتاؤں جنازے پہ کیسی رونق تھی۔ وہ جنازہ تھوڑا ہی لگ رہا تھا۔ یہ لگتا تھا کہ برات نکل رہی ہے۔"

بڑی بو کے کمرے میں چالیس دن تک پابندی کے ساتھ چراغ جلا اور اگربتی سلگی۔ چالیسویں کے بعد ایک دن بوجان کہنے لگیں "بی بی چالیس دن تک اس کمرے میں کیسی رونق رہی ہے۔ اگربتی تو میں شام کو سلگاتی تھی۔ مگر کمرہ جو بیسوں گھنٹے مہکتا رہتا

تھا اور خوشبو بھی عجب طرح کی تھی۔ اے بی بی چالیسواں ہوتے ہی کمرے میں کیسا سناٹا چھایا ہے۔ جیسے آئے مہمان چلے گئے ہوں"۔

چالیسویں پر عزیز رشتہ دار دور دور کے شہر سے چل کر آئے۔ تب مجھے اندازہ ہوا اور حیرانی بھی کہ یہ خاندان کتنا بڑا ہے اور کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے۔ کتنے دور پرے کے تایوں، چچاؤں کو پھوپھیوں، پھوپھاؤں کو، بہنوں بہنوئیوں کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ شیریں کو بھی جیسے پہلی ہی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ زمانہ جب ہم ساتھ ساتھ کھیلے تھے، بھول بسر چکا تھا۔ اب تو شیریں کا طور ایسا تھا۔ جیسے وہ مجھے جانتی ہی نہیں۔ مجھ پہ کیا موقوف تھا، چراغ حویلی کی کسی لڑکی لڑکے سے بات کرنا ہی اسے گوارا نہیں تھا۔ الگ الگ رہتی تھی۔ کتنا بڑا پن آ گیا تھا۔ اس میں چچی جان جس طرح بیبیوں کے بیچ بیٹھ کر اس کی تعریف کرتی تھیں۔ اس سے وہ اور اترانے لگی تھی۔ چچی جان نے سب کے بیچ بیٹھ کر کس فخر سے اعلان کیا تھا کہ "ہماری شیریں اب کالج میں پہنچ گئی ہے۔ ماشاءاللہ سے اتنی ذہین ہے کہ اپنے باپ سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے"۔

سب اس خبر پر ششدر رہ گئے۔ اصل میں ہمارے خاندان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک لڑکی تختی اور رحل کی منزلوں سے آگے نکل کر کالج میں پہنچ گئی تھی اور انگریزی لکھ پڑھ رہی تھی۔ تھی تو ابھی وہ فرسٹ ایئر ہی میں۔ لیکن مجھے اس نے ایسے مشورے دیئے جیسے وہ کالج کی زندگی کا لمبا تجربہ رکھتی ہے۔ مشوروں کی منزل بعد میں آئی۔ شروع میں تو وہ الگ الگ اور دور دور رہتی تھی۔ بس ایسا لگتا تھا کہ میرے اور اس کے بیچ میلوں کا فاصلہ ہے۔ مگر کیا ہوا کہ بوجان نے ایک دن مجھے ٹہوکا کہ بیٹے، شیریں آئی ہوئی ہے۔ اس سے تم کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ کالج میں داخلہ کے لئے تمہیں کیا کرنا ہے اور شیریں یہ سُن کر کہ میں بھی کالج میں قدم رکھنے لگا ہوں ایک دم سے مجھے پہ مہرباں ہو گئی۔ بس چھوٹتے ہی وہ بڑی بن گئی اور مجھے اپنا چھوٹا سمجھ کر کالج کی زندگی کے نشیب و فراز سمجھانے لگی۔

پھر اس قسم کے مشورے کہ مجھے کون کونسے مضمون لینے چاہئیں اور انگریزی میں مہارت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا پڑھنا چاہیئے۔

کالج کی حد تک میں نے بھی اسے بڑا مان لیا اور وہاں کی زندگی کے متعلق جی بھر کر معلومات حاصل کیں۔ میں یہ بھول ہی گیا کہ ابھی شیریں کو کالج میں گئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ خیر اس کے بعد میں بڑا بن گیا یہ اس وقت ہوا جب اسے حویلی کے پُراسرار گوشوں کے متعلق کرید ہوئی اور میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ سانپوں والی کوٹھری کے متعلق جو میں نے بڑی بوسے اور بوجان سے سنا تھا۔ سب اُسے سنا ڈالا۔ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ "وہ کالا ہے؟"

"بالکل کالا بھجنگ نہ اور یہ لمبا اور یہ موٹا جیسے اژدھا ہو۔"

اور اسی سانس میں میں نے اسے جعفر کی موت کا قصہ سنا ڈالا۔ جعفر سانپ کو مارنے میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ محلہ میں بلکہ پوری بستی میں جس گھر میں بھی سانپ نکلتا وہی مارنے کے لئے بلوایا جاتا تھا۔ مگر پھر اسے بھی بالآخر سانپ ہی نے ڈسا۔

"پتہ ہے اسے سانپن نے کیوں ڈسا تھا؟"

"کیوں ڈسا تھا؟"

"وہ سانپ کی آنکھیں کچلنا بھول گیا تھا۔"

"تو پھر؟"

"واہ شیریں تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں ہے۔ سانپ کو جب کوئی مارتا ہے تو اس کی آنکھوں میں مارنے والے کی تصویر اُتر آتی ہے۔ سانپن آکر اس کی آنکھوں کو دیکھتی ہے۔ پھر جس آدمی کی شکل اس کی آنکھوں میں نظر آتی ہے اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پھر اُسے چھوڑتی نہیں۔"

شیریں پہلے ہی حیران ہو رہی تھی۔ اب بالکل حیرت زدہ ہو گئی اور جیسے دل ہی دل